غیر مسلم ملکوں میں انکارِ منکر

ذکی الرحمن فلاحی مدنی

اللہ کی طرف دعوت دینے کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کسی کو برائی میں ملوث دیکھ کر اسے ٹوکا جائے۔ دعوتِ دین کے اندر جس طرح نیکی کی طرف بلانا شامل ہے، اسی طرح برائی سے روکنا بھی اس کے ضمن میں آتا ہے۔ اللہ تعالی نے دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے جو اجر و ثواب اور خاص فضیلت بیان فرمائی ہے اس میں انکارِ منکر کرنے والوں کا حصہ بھی ہے۔ ارشادِ باری ہے: (وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ)(آل عمران، 104) ''تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔'' اسی طرح اللہ تعالی نے ہمیں خبردار کیا ہے کہ خیرِ امت ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ منکرات پر نکیر کی جائے، اگر یہ وصف امتِ مسلمہ کے بعض افراد میں نہیں پایا جاتا تو ان سے خیرِ امت کا لقب بھی ساقط ہو جانا چاہیے۔ قرآنی فیصلہ سن لیجئے: (كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ)(آلِ عمران، 110) ''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔'' بالکل اسی طرح اللہ رب العزت نے توصیف آمیز پیرائے میں ایمان والوں کی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں: (وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَـٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ)(توبہ، 71) ''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکات دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم ودانا ہے۔'' تاہم یہاں جو چند باتیں سمجھنے کی ہیں ان میں پہلی بات یہ ہے کہ انکارِ منکر کے کئی درجے اور مرحلے ہوتے ہیں۔ اس میں بنیادی حیثیت اللہ کے رسول ﷺ کے اس قول کو حاصل ہے: ''اگر تم میں سے کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ برائی کو اپنے ہاتھ سے بدل دے، اگر وہ اس کی استطاعت اپنے اندر نہ پائے تو زبان سے اسے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اس کی استطاعت بھی وہ اپنے اندر نہ پائے تو اسے دل سے برائی کو بدلنے کی خواہش رکھنی چاہیے، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔'' [من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فإن لم یستطع فبلسانہ

فإن لم یستطع فبقلبہ وذالک أضعف الإیمان](صحیح مسلمؒ: 69)اس حدیث کی روشنی میں ہمیں بہت سے قیمتی علمی نکات پتہ چلتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ انکارِ منکر کے تین مرتبے ہوتے ہیں۔پہلا مرحلہ ہاتھ سے مٹادینے کا ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کے بہ قدر استطاعت وطاقت کا پایا جانا مشروط ہے۔دوسرا درجہ زبان سے نکیر کرنے کا ہے،اس میں بھی قدرت واستطاعت کی شرط مطلوب ہے۔تیسرا اور آخری مرحلہ دل سے انکار کرنے کا ہے اور برائی کو برا سمجھنے کا ہوتا ہے،جو کہ کمزور ترین ایمانی درجہ ہے۔اس کی شکل یہ ہے کہ دل سے برائی کو برا سمجھا جائے اور اسے مٹانے کا جذبہ بیدار رکھا جائے بہ ایں نیت کہ جب بھی اللہ قدرت واستطاعت سے نوازے گا تو آگے بڑھ کر زبان سے یا ہاتھ سے اس برائی کا قلع قمع کیا جائے گا اور معاشرے کو اس سے پاک کر دیا جائے گا۔ایمان کا یہ آخری درجہ ہوتا ہے جس سے فروتر ایمانی سیڑھی کا مزید کوئی پائے دان نہیں پایا جاتا،اور کسی بھی مسلمان کو اس سے کمتر درجے کے لیے معذور نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔کیونکہ بعض روایات میں آپ ﷺ نے صاف صاف فرمادیا ہے کہ اس کمزور ترین درجۂ ایمان کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہ جاتا ہے۔" [ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل](صحیح مسلمؒ: 50)معلوم ہوا کہ غیر اسلامی معاشروں اور ملکوں میں اگر کسی مسلمان کو ہاتھ اور زبان سے برائی کا ازالہ کرنے کے سلسلے میں معذور سمجھ لیا جائے کیونکہ وہاں سیادت وحکومت مشرکین وکفار کی ہے،تب بھی دل سے کسی برائی کو برا سمجھنے کے بارے میں کسی مسلمان کو معذور نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔غالباً کافر معاشروں کے بداثرات سے بچنے کا سب سے کارگر وسیلہ مسلم اقلیتوں کے پاس یہی ہے کہ وہاں پائی جانے والی برائیوں اور غلط باتوں کو دل سے برا سمجھیں،کہ اس طرح دل میں ایمان ویقین کی افزائش ونمو بھی ہوگی اور بار بار برائیوں کو ہوتے دیکھ کر نگاہیں اس کی عادی بھی نہ بننے پائیں گی اور مشرکانہ ماحول سے ہر وقت ایک ایمان افروز اجنبیت اور نامانوسیت کا احساس دلوں کو معمور ومنور رکھے گا۔اسی طرح غیر مسلم ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کے کرنے کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ اپنے بچوں کی ایسے انداز میں تربیت کریں کہ وہ مشرکانہ ماحول اور برائیوں کو دل سے برا جانتے رہیں۔ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ مسلم اقلیت کی نوجوان نسلوں کے دل سے صغرِ سنی میں ہی بعض برائیوں کے برا ہونے کا احساس ختم ہو جائے اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہو جائے کہ برائی کو برائی سمجھنے کے بجائے،مباح سمجھا جانے لگے،جس کا ارتکاب کرنے میں شرعاً کوئی مضائقہ یا حرج نہیں ہوتا۔یہ بات مسلم والدین اور سرپرستوں کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھنی چاہیے کہ برائی کو برا سمجھنا انسان کے مومن ہونے کی علامت ہے۔اگر کسی کے اندر یہ اسلامی حس مفقود ہے تو اسے اپنے دین وایمان کی فکر کرنی چاہیے کیونکہ حدیث سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایسے دل میں

رائی کے دانے کے برابر ایمان نہیں ہوا کرتا۔ دوسری اہم بات اس حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ کسی برائی کو دیکھ کر اصل ذمے داری یہ ہے کہ اسے بدل کر اچھائی کو اس کی جگہ قائم کیا جائے۔ حدیث میں تغییر (فلیغیّرہ) کا لفظ استعمال ہوا ہے، صرف نکیر کر دینے یا برا سمجھنے کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دونوں میں بہت نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انکار کی قدرت کے باوجود بسا اوقات ایسا نہ کرنا جائز ہوتا ہے، بایں طور کہ انسان کو اندازہ ہو کہ اگر انکار کیا جائے گا تب بھی منکر کو ہٹا کر معروف کا قیام عمل میں نہیں لایا جاسکے گا۔ بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ برائی پر نکیر کرنے والے کو روک دیا جائے۔ ایسا تب ہو گا جب کہ ایسا کرنے پر بڑے مفاسد و مضرات مرتب ہوتے ہوں، جو نکیر کرنے کی شرعی مصلحت سے زیادہ سنگین اور زیادہ خطرناک ثابت ہوں۔ آگے مزید اس کی تفصیل آئے گی۔ اس حدیث سے تیسری اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ نکیر یا سرزنش ایسی برائی پر کی جائے گی جس کا برائی ہونا اور جس شخص کو روکا جا رہا ہے اس کا مرتکبِ کبیرہ ہونا یقینی ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ اگر کوئی کسی برائی کو ہوتا دیکھے، تو نکیر کرے۔ یعنی محض گمان یا شک کی بنیاد پر نکیر نہیں کرنی چاہیے۔ یہاں پھر ایک بار سمجھ لینا چاہیے کہ کسی برائی پر نکیر کرنے کے متعدد درجات ہو سکتے ہیں۔ علامہ ابن القیمؒ نے انکارِ منکر کو چار درجوں میں بانٹا ہے اور بتایا ہے کہ ہر جگہ انکارِ منکر کا حکم مختلف ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''انکارِ منکر کی چار حالتیں ہیں: [1] پہلی حالت یہ ہے کہ انکارِ منکر کے نتیجے میں برائی کا ازالہ اور بھلائی کا قیام عمل میں آتا ہو۔ [2] دوسری حالت یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں برائی کا بالکلیہ استیصال تو نہ ہوتا ہو، البتہ اس میں کمی آجاتی ہو۔ [3] تیسری حالت یہ ہے کہ انکارِ منکر کے نتیجے میں متعلقہ برائی تو ختم ہو جاتی ہو، مگر اس کے بعد ویسی ہی دوسری برائی وجود میں آجاتی ہو۔ [4] اور چوتھی حالت یہ ہے کہ انکارِ منکر کے نتیجے میں متعلقہ برائی ختم ہو جائے اور اس کی جگہ اس سے بڑی برائی پیدا ہو جائے۔ ان چاروں حالتوں میں سے انکارِ منکر کی پہلی دو حالتیں جائز ہیں، جبکہ تیسری ہر فرد کی صواب دید اور اجتہاد پر مبنی ہے اور چوتھی حالت بالاتفاق حرام اور ممنوع ہے۔ مثال کے طور پر اگر بعض فاسق و فاجر لوگ جمع ہو کر کہیں شطرنج کھیل رہے ہوں، اس وقت اگر تم انہیں شطرنج کھیلنے سے روکتے ہو اور اس طرح انکارِ منکر کا فریضہ ادا کرتے ہو تو تمہارا یہ رویہ دلیل ہو گا کہ تم مومنانہ بصیرت، داعیانہ فراست اور تفقہ فی الدین سے خالی ہو۔ البتہ اگر تم یہ کرو کہ ایسے فاسقوں اور فاجروں کو شطرنج سے ہٹا کر کسی ایسے مشغلے میں لگا دو جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو پسند ہے جیسے کہ تیر اندازی ہے یا گھڑ دوڑ وغیرہ کی تفریحات ہیں، تو انکارِ منکر کا یہ انداز درست ہو گا۔ اسی طرح اگر تم دیکھو کہ کچھ فساق و فجار جمع ہو کر کوئی کھیل کھیل رہے ہیں یا سیٹیاں اور تالیاں بجا رہے ہیں، اگر تم

ایسے لوگوں کو اپنی نکیر کے ذریعے نیک کام میں لگا سکو تو ایسا جائز اور شرعاً مطلوب ہے، ورنہ بہتر یہ ہے کہ انہیں ان کی اسی حالت پر چھوڑ دیا جائے تاکہ یہ لوگ اس میں مصروف رہیں اور اس سے فرصت پا کر کسی دوسرے بڑے گناہ کا ارتکاب نہ کریں جس سے وہ صرف اس لیے باز ہیں کیونکہ ابھی وہ کھیل تماشے میں مصروف ہیں۔ میں (یعنی علامہ ابن القیمؒ) نے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ سے سنا ہے کہ وہ اور ان کے بعض ساتھی تاتاریوں کی یورش کے زمانے میں کہیں جا رہے تھے۔ ان کا گزر تاتاریوں کی ایک جماعت کے پاس سے ہوا جو کھلے عام پبلک جگہ پر بیٹھے شراب نوشی کر رہے تھے اور گندے گندے مذاق کر رہے تھے۔ استاد امامؒ کہتے ہیں کہ میرے ساتھیوں میں سے بعض لوگوں نے ان کو اس برائی سے روکنا چاہا تو میں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا اور کہا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام کیا ہے کیونکہ وہ اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے، مگر جن لوگوں کو تم شراب نوشی سے روکنا چاہ رہے ہو ان کا حال یہ ہے کہ شراب کی مدہوشی انہیں انسانی خون بہانے سے، بچوں کو قیدی اور غلام بنانے سے اور مالوں کی لوٹ مار کرنے سے روکتی ہے، اس لیے بہتر ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور نکیر نہ کی جائے۔'' (اعلام الموقعین عن رب العالمین، ابن القیمؒ 40/3:) دینی فہم و بصیرت کا یہ نہایت نازک مقام ہوتا ہے اور انکارِ منکر کے حوالے سے اس کی رعایت کرنا از حد ضروری ہے۔ اس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ غیر مسلم ممالک میں منکرات و معاصی کا مشاہدہ کرنے کے علی الرغم، ان پر نکیر کرنا یا انہیں ہاتھ اور زبان سے مٹانے کے درپے ہونا مناسب نہیں ہوتا، کیونکہ کسی ایک مسلم فرد یا جماعت کے اس اقدام کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ سکتے ہیں، نفرتیں بڑھ سکتی ہیں اور قانونی طور پر نہی عن المنکر کرنے والے کو گرفتار کیا جا سکتا ہے اور دہشت گرد یا فنڈامینٹلسٹ بتا کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے میں سڑایا جا سکتا ہے اور ناقابلِ تصور ٹارچر کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح غیر اسلامی ملکوں میں ہاتھ اور زبان سے انکارِ منکر کرنے سے ایسی برائیاں ظہور پذیر ہو سکتی ہیں جن کا وجود مسلم کمیونٹی کے لیے اُن برائیوں سے کہیں زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہو جن پر نکیر کی گئی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ کسی بھی غیر اسلامی ملک میں نظامِ سلطنت و حکومت غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اور کسی مسلمان فرد یا جماعت کے بس میں نہیں ہوتا کہ ہاتھ اور زبان کی طاقت استعمال کر کے کسی منکر کا خاتمہ کر سکے، چنانچہ عدمِ استطاعت کی صورت میں وہاں انکارِ منکر فرض نہیں ہوتا، بلکہ ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ انکارِ منکر کے نتیجے میں جتنی بڑی برائی رونما ہو گی، اسی قدر یہ انکارِ منکر غلط اور ممنوع ہو جائے گا۔ اس بارے میں علامہ ابن القیم کی بات بڑی گہری دینی بصیرت کا

پتہ دیتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''اللہ کے نبی ﷺ نے اپنی امت کے لیے انکارِ منکر کا فریضہ مشروع کیا ہے تاکہ برائیوں کے بدلے ایسی بھلائیاں فروغ پا سکیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب ہوتی ہیں۔ لیکن اگر کسی موقعے پر انکارِ منکر کے نتیجے میں زیادہ بڑی برائی اور اللہ اور رسول ﷺ کو زیادہ ناپسند آنے والا شر پیدا ہو رہا ہے تو انکارِ منکر کرنا درست نہیں ہوگا، حالانکہ دل سے ہم پھر بھی یہی مانیں گے کہ اس برائی میں ملوث افراد اللہ کے مبغوض اور ملعون بندے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ظالم بادشاہوں اور جابر گورنروں کی غلط کاریوں پر تنقید کرنے کے لیے بغیر مکمل تیاری کیے ان کے خلاف بغاوت کا راستہ اختیار کیا جائے۔ یقیناً مسلح بغاوت اور انقلاب کا یہ راستہ ہمہ گیر فتنے و فساد اور متنوع شرور و آفات کے ظہور کا راستہ بنتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں جتنے بھی چھوٹے بڑے مسلح فتنے اور خانہ جنگیاں برپا ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر کا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے انکارِ منکر کی راہ میں اُس دینی حکمت و مصلحت کو نظر انداز کر دیا جسے ہم اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت و سنت میں دیکھتے ہیں۔ کسی نے برائی کو ہوتے دیکھا تو صبر و ضبط سے کام نہ لیا اور اسے مٹانے کی کوشش کر ڈالی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک اور زیادہ بڑی برائی پیدا ہو گئی۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت دیکھیے، مکے میں سب سے بڑی برائی اور سب سے بھیانک آفت شرک کا وجود تھا، آپ ﷺ دن رات شرکیہ عبادات و اعمال کو بہ چشمِ خود دیکھتے تھے، مگر انہیں بہ زورِ بازو مٹانے کی کوشش نہیں فرماتے تھے، کیونکہ بہ زورِ بازو برائی کو مٹانا اس وقت تک آپ ﷺ کی استطاعت میں نہیں تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مکہ مکرمہ کو اسلام کے لیے مفتوح کر لیا اور وہ دار الکفر کے بجائے وہ دار الاسلام اور مسلمانوں کا قبلہ بن گیا، اس وقت آپ ﷺ نے چاہا کہ خانۂ کعبہ کو موجودہ غلط شکل سے ہٹا کر دوبارہ انہی بنیادوں پر تعمیر کر دیا جائے جو حضرت ابراہیمؑ نے رکھی تھیں اور جن کے مطابق انہوں نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی تھی۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ عہدِ جاہلیت میں سیلاب کی وجہ سے خانۂ کعبہ کی عمارت ڈھے گئی تھی، کفارِ قریش کے پاس جائز آمدنی کا اتنا پیسہ نہ تھا کہ پوری عمارت دوبارہ تعمیر کر پاتے۔ چنانچہ انہوں نے ادھوری عمارت تعمیر کی اور خانۂ کعبہ کا ایک حصہ بغیر تعمیر کیے خالی چھوڑ دیا جسے ''حطیم'' کہا جاتا ہے۔ آپ ﷺ اسی غیر مسقف حصے کو مسقف بنانا چاہتے تھے اور خانۂ کعبہ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ مگر آپ ﷺ اپنے اس ارادے سے باز رہے، حالانکہ آپ ﷺ چاہتے تو اب بہ زورِ قوت و طاقت ایسا کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ کیونکہ آپ ﷺ کو اندیشہ تھا کہ قریش جو ابھی حال ہی میں حلقہ بہ گوشِ اسلام ہوئے ہیں وہ اپنے دینی معبد اور مذہبی قبلے میں اتنی بڑی تبدیلی غالباً برداشت نہ کر سکیں گے۔ یہاں ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ آپ ﷺ نے

اُن سے فرمایا تھا: ''اے عائشہؓ! اگر تمہاری قوم ابھی جلد ہی جاہلیت سے نہ نکلی ہوتی تو میں خانۂ کعبہ کو منہدم کراتا اور وہ حصہ بھی اس میں شامل کر دیتا جسے باہر نکال دیا گیا ہے، اور اسے (بجائے سطحِ زمین سے اونچا رکھنے کے) زمین سے ملا دیتا اور مشرق و مغرب میں اس کے دو دروازے بنا دیتا، تاکہ خانۂ کعبہ مکمل طور سے انہی بنیادوں پر استوار ہو جائے جن پر حضرت ابراہیم نے اُسے اٹھایا تھا۔'' [یا عائشۃ لولا أن قومک حدیثوا عہد بجاہلیۃ لأمرت بالبیت فہدم فأدخلت فیہ ما أخرج منہ و ألزقتہ بالأرض وجعلت لہ بابین بابا شرقیا و بابا غربیا فبلغت بہ أساس إبراہیم] (صحیح بخاریؒ: 1586) یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے امراء و سلاطین کی برائیوں پر ہاتھ سے یعنی قوت کا استعمال کرتے ہوئے نکیر کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں ایسی ایسی برائیاں وقوع پذیر ہو سکتی ہیں جو یقینی طور پر موجودہ برائیوں سے کہیں زیادہ سنگین اور مضرت رساں ہونگیں۔'' (دیکھیں إعلام الموقعین، ابن القیمؒ: 40/3) بالکل اسی طرح اگر یقینی طور پر معلوم ہو جائے یا غالب گمان ہو کہ انکارِ منکر کے نتیجے میں کوئی دینی مصلحت حاصل نہیں ہو سکے گی یا برائی میں ملوث افراد باوجود سرزنش و انکار کے اپنی برائی پر ہی اڑے رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ برامان کر احکامِ شریعت کا مذاق اڑانے لگیں، تو ایسے میں انکارِ منکر کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں امام عزؒ بن عبد السلام لکھتے ہیں: ''اگر بھلائی کا حکم دینے والا، یا برائی سے روکنے والا فرد یقین یا ظنِ غالب کی حد تک یہ جان لے کہ اس کے امر و نہی سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو گا اور کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہ ہو گا، تو نہی عن المنکر کی ذمے داری اس سے ساقط ہو جاتی ہے، گرچہ ہم کہیں گے کہ سقوطِ فرضیت کے باوجود بھی اس کے حق میں انکارِ منکر پر عامل ہونا مستحب اور شرعاً پسندیدہ امر مانا جائے گا۔ اس حالت میں فریضۂ انکارِ منکر کے سقوط کی وجہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک وسیلۂ محض ہے قیامِ خیر اور ازالۂ شر کا۔ اب اگر کسی کو یقین ہو جائے کہ ایک خاص موقعے پر یہ مقاصد اس وسیلے سے حاصل نہیں ہو سکیں گے تو یہ وسیلہ اس وقت ساقط الاعتبار ہو گا۔ خود اللہ کے رسول ﷺ عہدِ مکی میں مسجد الحرام میں داخل ہوا کرتے تھے اور وہاں غیر اللہ کے بتوں اور مورتیوں کو رکھا ہوا دیکھتے تھے، مگر اس پر کوئی عملی یا قولی نکیر نہیں فرماتے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال سلفِ صالح کا بھی تھا کہ وہ بہت بار فاسقوں، فاجروں اور ظالموں کو ان کے فسق و فجور اور ظلم و طغیان پر سرزنش نہیں فرماتے تھے، حالانکہ وہ ان کے ظلم و ستم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ ان کی رائے یہ ہوتی تھی کہ ان کے انکارِ منکر سے مطلق کوئی نتیجہ، یا کم از کم کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔'' (قواعد الأحکام فی مصالح الأنام، عز الدین بن عبد السلامؒ: ص 109) محولہ بالا تفصیل کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ غیر اسلامی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں پر انکارِ منکر کا فریضہ ہاتھ اور زبان کی حد تک واجب نہیں ہوتا اور اس وقت تک

واجب نہیں ہو گا جب تک کہ انہیں منکرات کے ازالے کی سیاسی و قانونی قوت و حیثیت حاصل نہ ہو جائے۔ ہم جس سیاسی و قانونی قوت کی بات کر رہے ہیں اس کے حصول کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ پورا ملک دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے اور اسلامی نظامِ زندگی وہاں قائم ہو جائے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہاں کی حکومت کسی مسلمان کو ایسی سرکاری نوکری یا منصب دے دے جس میں اس کا کام ہی عام برائیوں کی، یا کسی خاص برائی کی روک تھام کرنا ہو۔ اگر صورتِ حال یہ ہو تو اس مسلمان پر واجب ہو گا کہ وہ قانونی حمایت اور سرکاری قوت کا استعمال کرتے ہوئے متعلقہ برائی کا قلع قمع کرے۔ اس کی مثال میں وہ تمام برائیوں پیش کی جا سکتی ہیں جنہیں ہر انسانی سماج میں قانونی جرائم سمجھا جاتا ہے جیسے کہ زناکاری، چوری، ڈکیتی یا ناحق دست درازی وغیرہ۔ اسی طرح اگر کسی غیر اسلامی ملک میں اظہارِ رائے کی آزادی ہو اور قانونی طور پر برائیوں سے روکنے ٹوکنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہو، اگر ایسے غیر اسلامی ملک میں کوئی مسلمان کسی برائی کو ہوتا دیکھے اور وہ برائی ایسی ہو جس کے برا ہونے پر سارے سلیم الفطرت انسان اتفاق رکھتے ہیں، تو زبان کی حد تک اس برائی پر نکیر کرنا مسلمان کے اوپر لازم ہو گا۔ اور اگر کسی ملک میں زبان اور ہاتھ سے انکارِ منکر کا قانونی جواز نہ پایا جائے تو وہاں رہنے والے ہر مسلمان پر واجب ہو گا کہ دل سے برائیوں کو برا جانے اور انہیں مٹانے کی خواہش اور آرزو کو اپنے سینے میں زندہ و فروزاں رکھے۔ جس طرح اس وجہ سے انکارِ منکر کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے کہ مسلمان کو یقین تھا یا ظنِ غالب تھا کہ روکنے کے باوجود منکرات انجام دینے والے لوگ باز نہیں آئیں گے، اسی طرح اس وقت بھی انکارِ منکر کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے جب یقین یا ظنِ غالب یہ ہو جائے کہ ایسا کرنے پر موجودہ برائی سے زیادہ بڑی اور زیادہ خطرناک برائی رونما ہو جائے گی۔ اس اصول پر چلتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی غیر اسلامی ملک کی مسلمان اقلیت کے لیے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر یہ جائز نہیں ہوتا کہ وہ وہاں کی کافر حکومت کے خلاف بغاوت کرے، یا وہاں کوئی مسلح انقلاب لانے کی کوشش کرے، حالانکہ وہ جانتے ہوں کہ موجودہ حالات اور ممکنہ وسائل کی بنیاد پر وہ ہرگز ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہونگے۔ کافر حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے مسلح بغاوت کی حرمت اس لیے ہے کیونکہ اس طرح کے اقدام سے جو بدنتائج رونما ہونگے اور جس طرح وہاں مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جائیں گے، تعذیب (ٹارچر) اور نسل کشی کی آفتیں ڈھائی جائیں گی وہ سب کچھ ناقابل برداشت ہو گا اور نہ جانے کتنے کمزور ایمان والے اس سے بچنے کے لیے ارتداد کا سہارا لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ ہمارا موقف ہے، واللہ اعلم بالصواب۔